Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:6 (1968)

اسلامی معاشرہ میں فرد کا مقام

سلطانہ زمان زبیری ☆ ترجمہ: محمد عیسیٰ

معاشرہ کی ساخت اور اس کا عمل

لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو لفظ سوسائٹی (SOCIETY) لاطینی لفظ (SOCIETAS) اور قدیم فرانسیسی لفظ (SOCIETE) سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی رفیق یا ساتھی کے ہیں (۱)۔ اس اصطلاح سے مراد اپنے رفیقوں کے ساتھ میل جول ہے خصوصیت سے گہری دوستی کے انداز میں۔ نیز یہ لفظ اس حالت یا کیفیت کو بھی بتلاتا ہے جو ساتھ مل جل کر رہنے سے پیدا ہوتی ہے[۱]۔ معاشرہ مختلف العناصر انسانوں کی ایک بھیڑ کا نام نہیں ہے یا افراد کے غیر منظم مجموعہ کو نہیں کہتے جن کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ وسعتِ نظر سے دیکھا جائے تو اس اصطلاح کا اطلاق انسانی روابط کے کل مجموعہ پر ہوتا ہے (۲)۔ اس کا اطلاق انسانوں کی مربوط و منظم جماعت پر ہوتا ہے۔ معاشرہ انسانی روابط کی اس تنظیم کا نام ہے جس کو ہم خیال افراد نے بنایا ہو اور یہیں سے اس کو غذا ملتی ہو۔ روابط کے اس مجموعہ کی تہہ میں جس میں افراد ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، مقاصد میں وحدت، مفادات میں یکسانیت اور امتیازی ضابطۂ حیات کارفرما ہوتے ہیں (۳)۔ ان مشترک معیاروں اور مفادات سے انسانوں کے تخلیقی عمل اور بامقصد استحکام کو تحریک ملتی ہے جس سے وہ ایک بہتر دنیا تعمیر کرتے ہیں۔

معاشرہ (SOCIETY) کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:۔ یہ انسانی روابط کا ایک کلی مرکب ہے اس حیثیت سے کہ یہ روابط عمل سے پیدا ہوتے ہیں جو ذرائع و مقاصد کے رشتہ سے قائم ہے[۴]۔

MACIYER نے معاشرہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: یہ روابط کے ایسے سلسلوں کا نام ہے جو باہمی طور پر لامحدود طریقہ سے گتھے ہوئے ہوں اور جو ان انسانوں کے ارادوں اور مقاصد کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہوں، جنہیں اپنی ہم آہنگی اور بااختیاری کا شعور ہو۔ مختصراً یہ روابط ایک جماعت (COMMUNITY) کے باہمی عمل

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

سے پیدا ہوئے ہوں۔(۵)

معاشرہ انسانی طرزِ عمل کو منظم کرتا ہے اور اس کے چلن کی نگرانی کرتا ہے۔ ارسطو جو اس علم کا باوا آدم ہے، انسانوں کو "ایک معاشرت پسند حیوان" بتلاتا ہے۔ انسان دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ انسانی فطرت میں یہ عنصر موجود ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے۔ اس معاشرت پسند عنصر کو ڈاکٹر ٹروٹر گروہ پسند فطرت کہتا ہے۔ ڈاکٹر ٹینسلے اس کو جماعت پسند فطرت اور معاشرت پسندانہ جذبہ کہتا ہے۔ میک آئور اس کو معاشرتی فطرت کہتا ہے۔ گڈنگز اس کو شعورِ نوع کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور ویسٹ مارک اس کو معاشرتی مفاد کا نام دیتا ہے (۶)۔

انسان حیوانی جبلت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے (۷)۔ فطرت کے لحاظ سے وہ ضعیف ہے، جاہل ہے اور نادان ہے (۸)۔ انسان اور شیطان نے اس دنیا میں ساتھ ساتھ قدم رکھا ہے (۹)۔ انسان کی طبیعت میں بغاوت ہے (۱۰)۔ اور شرک کی طرف مائل ہے (۱۱)۔ اسے اپنی نفسانی خواہشات کو روکنے کے لئے مضبوط قید و بند کی ضرورت ہے۔ خدا نے اس کو قوتِ ارادی اور قوتِ ذہنی عطا کی ہیں جو شدت کے ساتھ شخصی نظم و ضبط چاہتی ہیں۔ اس کا نفسیاتی مزاج لچکدار ہے۔ اپنے ماحول سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کی آرزوؤں اور مقاصد کے نمونہ پر اس کے رجحانات ڈھلتے ہیں۔ معاشرتی ورثہ اُس کے لئے محرک ہوتا اور اُسے راستہ دکھاتا ہے، اور اس کی خودی کو پروان چڑھاتا ہے۔ منشاء کے مطابق اس سے عمل کرانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ماحول کی حد بندی مناسب طریقہ پر کی جائے۔ خدا نے اس کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے (۱۲)۔ زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے (۱۳)۔ اور اس کو وہ امانت سپرد کی ہے جس کے قبول کرنے سے تمام کائنات نے انکار کر دیا تھا (۱۴)۔ خدا نے انسان کو اپنی روح پھونک کر بنایا ہے (۱۵)۔ اس لئے انسان کائنات کی ہر مخلوق سے مختلف ہے۔ وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے۔ ان قوتوں کو اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ خونخوار وحشی بن جاتا، اور اس طرح اسفل سافلین میں گر سکتا ہے (۱۶)۔ اگر صراطِ مستقیم پر اس کو ڈال دیا جائے تو یہ قوتیں اس کو اوجِ کمال تک پہنچا سکتی ہیں (۱۸)۔ اس تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کا کام یہ ہے کہ انسان کی اِن مخفی قوتوں کے لئے میدان فراہم کرے اور آزادی سے کام کرنے کے مواقع مہیا کرے۔

اس کام کو انجام دینے کے لئے معاشرہ اجتماعی حد بندیوں اور قانونی سزاؤں کے وسائل مہیا کرتا ہے،

جو ان اساسی داخلی اصولوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں جن پر معاشرہ کا قیام ہے۔ معاشرتی نظام رواج اخلاق و عادات رسوم اور ضابطوں کے ایسے مرکب ڈھانچے کو جنم دیتا ہے جو ترقی پاکر ایک وقت میں اداروں اور تنظیموں کی شکل میں رونما ہوں۔ یہ افراد کو معاشرتی معیاروں پر چلنے، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کو جذب کرنے اور اپنی زندگی کو کسی بامقصد نظریہ سے منظم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان سے افراد اپنے عمل میں مقصد اور توازن حاصل کرتے ہیں اور اس طرح معاشرہ امن و ترقی کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

معاشرہ اور فرد کے درمیان رشتہ

فرد اور اس کے معاشرہ کے درمیان عضویاتی یا میکانکی رابطہ نہیں ہے۔ افراد نہ تو کٹ پتلیاں ہیں اور نہ پہیئے کے دائرے ہیں۔ ان کا معاشرتی ردعمل غیر شعوری نہیں ہے۔ معاشرہ سے اُن کا تعلق ایسا نہیں ہے جیسا پتوں کا تعلق درخت سے، خلیوں کا تعلق جسم سے یا اعضاء کا تعلق منظم مجموعہ اعضاء سے۔ معاشرہ اور فرد ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ہر فرد معاشرتی رشتہ سے بندھا ہوا ہے۔ وہ معاشرہ میں زندہ رہتا ہے اور اسی میں نشو و نما پاتا ہے۔ اس کا کُل وجود معاشرتی اثرات اور دباؤ سے متاثر ہے۔ انسان معاشرہ سے باہر رہ کر انسان نہیں بن سکتا۔ فردیت کے ظہور کا دارومدار کلی طور پر معاشرتی تنظیم پر ہے۔ معاشرہ میں فرد کے لئے خود کو سمجھنے اور کام میں لگانے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے باہر نہ اس کی کوئی شخصیت ہے نہ مقام نہ اخلاق و کردار۔

اسی مسئلے کو دوسرے رُخ سے دیکھیں تو فرد ہی معاشرہ کی حقیقی و آخری وحدت ہے۔ معاشرہ کی قدر و قیمت ہی وہ شخصیت ہے، جس کو افراد قائم کرتے ہیں۔ معاشرہ مربوط عضویاتی مجموعہ سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے۔ عقل و روح سے ماوراء اس کے پاس کچھ نہیں۔ مشاھدہ و فکر کے لئے اس کے پاس کوئی مرکزی عضو نہیں جس کو اسپنسر (SPENCER) مشترک احتساب (COMMON CENSORIUM) کہتا ہے۔ صرف افراد میں ہی سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ معاشرہ کا وجود تو صرف افراد کے ذہن اور عمل میں ہوتا ہے۔ معاشرہ اپنے آپ کو انسانوں کے اندر ڈال دیتا ہے۔ انہیں میں زندہ رہتا ہے اور سانس لیتا ہے۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، معاشرہ اپنی وحدتوں کے ارتقاء کے ساتھ خود بھی ترقی کرتا ہے۔ اچھے افراد اچھا معاشرہ بناتے ہیں۔ فرد خود معاشرہ کی پیداوار بھی ہے اور معاشرہ کو بناتا بھی ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ معاشرتی عامل بھی ہے اور معاشرتی پیداوار بھی۔ اس کی فردیت اور معاشرتیت ایک ہی سکہ کے دو رُخ

ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فرد کا معاشرہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

کُل اور وحدت میں اس وقت تک توازن پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک فرد اور اس کے معاشرہ کے نظریاتی مقاصد یکساں نہ ہوں۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی اسلامی نظام کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔اسلام مومن کی شخصی و اجتماعی زندگی کے لئے معاشرہ سے بالاتر ایک عظیم الشان مقصد پیش کرتا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان قادرِ مطلق خدا کے ارادہ کے سامنے جھک جائے تاکہ وہ اپنے وجود کی کلیت کو اسلام کے نمونہ پر ڈھالے اور اس طرح منشائے الٰہی کے سامنے اپنے آپ کو جھکائے (۱۹)۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے صحیح کہا ہے کہ خدا کے سامنے جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے رجحانات میں عمل میں اور اپنی زندگی کو منضبط کرنے میں اپنے آپ کو خدا کے سامنے جھکا دے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا کا تصور محض ایک عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک معیار ہے اور زندگی کو ضابطہ میں لانے والی چیز۔ خدا ہماری اعلیٰ قدروں کا ضامن ہے۔(۲۰) خدا کا نظامِ حکومت اور اس کے مقاصد عالمِ انسانی میں پورے ہوتے ہیں۔ انسان کا شخصی کردار چال چلن اس کا اجتماعی طرزِ عمل اور اس کے بین الاقوامی رشتے اسلامی روح سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور کائنات کے خدائی منصوبے کے ساتھ پیوستہ ہونا چاہیئے۔ اسلام کا مذہبی کارنامہ زندگی کی ہماہمی کے اندر ہے۔ انسان کو خدا کی مشیئت پر معاشرتی و سیاسی اخلاقی نظام کے ساتھ عمل کرنا ہے۔ پوری امتِ مسلمہ عالم میں انسان کے لئے خدائی احکام کا مخزن ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:۔

> "جو چیز اُمت کو بنیادی طور پر قائم کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُمت نے شعوری طور پر اپنا مقام یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ مشیئتِ خداوندی کی حامل ہے۔ یہ مشیئتِ خداوندی انسان کے لئے خدا کا حکم ہے، جس کو شریعت کہتے ہیں۔ اپنے حکومتی و اجتماعی اداروں کے ذریعہ اس امانت کو عملی طور پر نافذ کرنا ہے۔ شریعت اُمتِ مسلمہ کا دستور ہے۔" (۲۱)

اسلامی معاشرہ کا تاریخی ارتقاء اور اس کا انقلابی مزاج

اسلامی معاشرہ کی عمارت اسلام کے فعال و حرکی دین پر قائم ہے۔ عالمی اسلامی معاشرہ ایک خود مختار تنظیم ہے، جس پر خود اس کے اپنے قوانین چلتے ہیں۔ اس میں ایسی اسلامی تہذیب اور اخلاقی اقدار سرایت کی ہوئی ہیں، جس میں ہر فرد ان بنیادی اصولوں کی بالادستی و عالم گیریت تسلیم کرتا ہے جس کو اسلام نے قائم

کیا ہے۔ آیئے ذرا چودہ سو سال میں عالم گیر اُمت مسلمہ کے ارتقاء دلنشو دنما پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

سید امیر علی کے الفاظ میں "ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی معاشرتی اور دینی انتشار کا دور تھا۔ وہ مقدس شعلے جن کو زردشت، حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ نے فروزاں کیا تھا، انسانی خون میں بجھ چکے تھے۔ بگڑی ہوئی زردشتیت نے جو اس سے زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت کے ساتھ برسرِ پیکار تھی، انسانیت کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا اور دنیا کے پُرمسرت حصوں کو جہنم میں تبدیل کر دیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی بھی ایسا وقت نہیں آیا جب کسی نجات دہندہ کے ظہور کی اتنی شدید ضرورت محسوس ہوئی ہو اور ایسا مناسب موقع آیا ہو۔ (۲۲)

انسانیت کو نجات دلانے والی ذاتِ اقدس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مکہ کے تجارتی ماحول میں پیدا ہوئی۔ وہ غارِ حراء سے تاریخ کی تیز روشنی میں ایک حیرت انگیز پیغام لے کر نمودار ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روحانی انتشار، معاشرتی ناانصافی، اقتصادی استحصال اور انسانیت سوز افعال کے خلاف آواز بلند کی۔ آپؐ نے توحیدِ باری، وحدتِ انسانیت، فرد کے مقام اور اجتماعی و اقتصادی انصاف کی طرف بلایا۔ اسلام ایک ایسی معاشرتی اصلاحی تحریک کی حیثیت سے ظاہر ہُوا جو خالص توحید پر قائم تھی، ایمان والوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ نیا دینی گروہ آئندہ بننے والی اُمتِ مسلمہ کی مختصر سی صورت تھی۔ اس مرحلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقی ضمیر، تزکیۂ نفس، تہذیبِ نفس، جماعتی شیرازہ بندی، انسانیت اور اجتماعی انصاف کو عام کر دیا۔ نماز با جماعت اور زکوٰۃ کو قائم کیا گیا۔

اس اسلامی تحریک کا اہلِ مکہ پر تیزی سے ردّ عمل ہُوا۔ پروفیسر گب کے الفاظ میں :" اُبھرتی ہوئی عداوت اور مذہبی جذبہ کے سامنے جو تنگ دیواروں کے درمیان بند تھے، ایک راستہ تھا جو دل تک پہنچتا تھا۔ ظلم و ستم اور معاشرتی رکاوٹوں نے اس شوق و جذبہ کو مزید تیز کر دیا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک ہی وقت میں اسلامی تحریک کے لئے قوتِ محرکہ اور آخری سہارا ثابت ہُوا۔" (۲۳)

اس کا بیج مکہ میں پڑ چکا تھا لیکن اُمتِ مسلمہ کو اس کا پھل اس وقت ملا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی اور مدینہ کا مشہور منشور نافذ فرمایا۔ جس کے الفاظ یہ ہیں :" یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک منشور ہے جو قریش و یثرب کے مسلمانوں کے درمیان روابط قائم کرنے کے لئے بنایا گیا ہے)۔ ان کے ساتھ جو لوگ بھی ان کا اتباع کریں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ اور ان کے ساتھ مل کر لڑیں

اور جہاد کریں۔ تمام لوگوں سے[24] علیحدہ وہ ایک ہی اُمت ہیں " (۲۵)

مکہ سے آنے والے مہاجرین اور مدینہ کے انصار کے درمیان مواخات کے بعد اسلامی تحریک کو مزید قوت حاصل ہوگئی۔ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظری لحاظ سے سیاسی خطوط پر ایک خود مختار ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔ پروفیسر گب لکھتے ہیں: " مدینہ میں نئی بات یہ تھی کہ مذہبی اُمت نظری حیثیت سے نکل کر عملی حیثیت میں وجود میں آگئی " (۲۶)۔ مدینہ میں اخلاقی اقدار سے نکل کر اُمتِ مسلمہ کو ایک سیاسی و ریاستی اُمت کا مقام حاصل ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب اس کام میں مشغول تھے کہ ایسی اُمت کی تنظیم کریں جس کا تشخص اور انفرادیت درجہ بہ درجہ ترقی کرکے متعین ہو جائے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب رقمطراز ہیں: " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی اسلام کی بڑی بڑی امتیازی خصوصیات کا ارتقاء ہو چکا تھا۔ ان میں اُمتِ مسلمہ کا قیام تھا جس میں دین کی اخلاقی اور روحانی صفات کا اظہار تھا جو مختلف اداروں کے ذریعہ کیا گیا اور جن کی پشت پر حکومتی تنظیم کارفرما تھی " (۲۷)

اسلامی تہذیب کے پھیلنے کے نتیجہ میں مفتوحہ علاقوں میں ان کی چیزوں کو اسلامی بنانے کا طریق عمل مسلسل جاری رہا۔ غیر اسلامی ادارے اور مقامی عناصر یا تو اسلامی ڈھانچے میں مدغم ہو گئے یا پھر نسیاً منسیا ہو کر ختم گئے۔ قانونی اور انتظامی نظام میں ترقی ہوئی اور اسلامی تصورات کو مزید جلا دی گئی۔ ایک اسلامی عالمی اُمت کا قیام ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر وجود میں آیا۔ اسلام نے مقامِ انسانیت میں تبدیلی پیدا کی اور معاشرہ کی پوری ساخت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے الفاظ میں: " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی کارناموں کو اس بنیاد پر جانچا جائے گا کہ آپؐ نے انسانیت کو کیا کچھ دیا۔ آپؐ نے کچھ اُصول و معیار دیئے اور ان کے حصول کا متعین طریقہ بھی بتایا۔ جن میں آج بھی انسانیت کی تمام خرابیوں کا علاج موجود ہے " (۲۸) ———— ایک نیا انسان اور ایک نیا معاشرہ پیدا کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی تاریخ کا پورا راستہ بدل دیا۔

اسلام میں معاشرتی تنظیم

ایک ایسی اجتماعی تنظیم جس کی بنیاد دینِ اسلام پر ہو، اس کو اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ایسا معاشرہ جس میں انسانی روابط کا پورا ڈھانچہ ایک اجتماعی نظام کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے معیار پر قائم ہو۔ جماعتی کام خصوصیت کے ساتھ اسلامی ہوں۔ اس کے ادارے اور تنظیمیں

ان تہذیبی اور اخلاقی اقدار اور معیاروں پر پوری اُترتی ہوں، جو اسلام نے پیش کئے ہیں۔ پورے معاشرہ پر اسلام کی چھاپ نمایاں ہو۔ اسلامی معاشرہ کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے: "اجتماعی روابط کا پورا نظام جو ایسے افراد کے ساتھ قائم ہو جو خدا اور اس کے آسمانی قانون کے پابند ہوں۔ اس کے رسولوں، فرشتوں، کتابوں، آخرت اور مرنے کے بعد حساب دینے پر ایمان رکھتے ہوں۔"

قرآن مجید میں اجتماعی تنظیم کی کسی نہ کسی شکل کا تصور ملتا ہے تاکہ اس مادی دنیا میں اس کی حکومت بن سکے اور اس کے مقاصد پورے ہوں۔ قرآن مجید مسلمانوں کو خدا کی رسّی مضبوطی سے پکڑنے[29] پر زور دیتا ہے۔ اور حزب اللہ[30] کے قیام کی تاکید کرتا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ وہ معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے (۳۱)۔ امتِ مسلمہ ایک اجتماعی تنظیم چاہتی ہے تاکہ وہ اپنی مجموعی زندگی کو منظم اور قرآن کے احکام کو نافذ کر سکے جن میں اجتماعی اہمیت[32] یا معاشرتی وزن کا حصہ زیادہ ہے۔ اسلام ایک عالمگیر اجتماعی اور اخلاقی نظام کی تخلیق چاہتا ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے افراد موجود ہوں تاکہ وہ انسانیت کے امن و ترقی کے لئے کام کر سکیں اور بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے کاموں میں حصہ لے سکیں۔

اسلام میں معاشرتی تنظیم کے مندرجہ ذیل اُصول و مبادی ہیں:۔

۱ ——— مساوات

۲ ——— آزادی

۳ ——— اخوت

۴ ——— عدل

۵ ——— رواداری

اب ہم ان تصورات کا علی الترتیب مختصر طور پر جائزہ لیتے ہیں:۔

۱۔ **مساوات:** اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام کی نظر میں بحیثیت انسان کے سارے انسان برابر ہیں۔ وحدتِ انسانیت کا تصور وحدتِ خداوندی کے تصور سے خود بخود لازم آتا ہے۔ خدا کی ھدایت قدرتی طور پر ہمیں انسانیت کی وحدت کی طرف لے جاتی ہے۔ خالص توحید کا تصور اس وقت تک بے معنی ہے جب تک یہ سارے انسانوں کی مساوات کو مستلزم نہ ہو۔ ایک عملی تصور کی حیثیت سے توحید کے جوہر میں مساوات، اخوت اور آزادی داخل ہیں۔ قانون کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں۔ خواہ

وہ کسی رنگ علاقہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ قانون کے نفاذ میں کسی امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنی شخصی وانفرادی ترقی کے لئے ہر شخص کو برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ قابلیت نہ کہ نسل اور کردار نہ کہ رنگ فوقیت کے معیار ہیں۔ اسلام میں یہودیوں کی طرح کوئی منتخب گروہ نہیں ہے اسی لئے اسلام میں رہبانیت یا پاپائیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خدا کی نظر میں محبوب ترین انسان وہ ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے ـــــــ قرآن مجید واضح لفظوں میں کہتا ہے:۔

(۱) ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (۳۴) خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

(۲) ولکل درجت مما عملوا وما ربک لغافل عما یعملون (۳۵) ہر ایک کے لئے درجے ہیں جو انہوں نے عمل کیا۔ اور تمہارا رب اس سے غافل نہیں ہے جو تم عمل کرتے ہو۔

(۳) ولکل درجت مما عملوا ولیو فیھم اعمالھم وھم لا یظلمون (۳۶) ہر ایک کے لئے درجے ہیں جو اُنہوں نے عمل کیا تاکہ خدا ان کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

دنیا میں نیک بن کر زندگی گزارنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ اسلام کی اسی مساوات کا تصور تھا جس سے ان غلاموں نے جن کے ساتھ بے جان مشینوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، ایسی ترقی کی کہ ریاست کے حاکم تک بن گئے اور عورتیں جن کی حیثیت قابلِ خرید وفروخت اشیاء کی سی تھی اور جن کو مالِ منقولہ سمجھا جاتا تھا، ان کو ایک مقام حاصل ہو گیا۔

۲۔ آزادی: ایک مسلمان کو اس بارے میں پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ سوائے خدا کے اور کسی کی اطاعت نہ کرے۔ قانونِ الٰہی اور نظامِ الٰہی کے سامنے جھک جانا ایک فرد کو ہر ایک کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ آزادی کا مقصد بے عنان ہونا نہیں ہے۔ فیثا غورث سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ "آزاد آدمی کون ہے؟" اُس نے جواب دیا کہ "جو نیکی کے لئے وقف ہو جائے"۔ (۳۷) مسلمان خیر وشر کی جنگ میں مردِ جانباز ہے گارڈٹ (GARDET) کا کہنا ہے کہ مسلمان جھوٹی اور محض برائے نام آزادی کی غیر مشروط تلاش کا مخالف ہے ...... اس کے نزدیک آزادی کے کچھ معنی نہیں ہیں جب تک وہ خود اپنے آپ سے اور اپنے سے بالاتر ایک نظام سے ہم آہنگ نہ ہو۔ (۳۸) اسلام میں ہر فرد کو اپنے حقوق سے فائدہ اُٹھانے کی اس حد تک آزادی ہے کہ وہ شریعت کے مقرر کردہ حدود میں رہے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے۔

خدا کا حکم اس کے ضمیر کے لئے معاشرہ سے بلند تر نگران کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے تمام اعمال کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ قرآن مجید صاف صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ (۳۹)

۳۔ اخوت: اخوت اسلام کا جوہر ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے:۔ انما المومنون اخوۃ (۴۰) مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان ایک ہی برادری کے ارکان ہیں۔ اونچے اور نیچے بادشاہ اور کسان حقوق میں سب کا درجہ ایک ہے۔ اور ذمہ داری بھی مساوی۔ ان کے تعاون اور ساتھ مل کر کام کرنے سے ہی اُمت میں وحدت اور استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت ہے کہ ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ (۴۱)

اسلامی اخوت کو جو قوت حاصل ہے وہ خونی رشتہ کو بھی نہیں۔ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم سے خونی رشتہ ہونے کے باوجود اس کی شہریت قطعاً دوسرے سے مختلف سمجھی جائے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے باپ اور بیٹوں کے خلاف جنگ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن مکہ پر حملہ کیا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں کے خلاف جہاد کیا۔ اسلامی اخوت اس وقت پھلی پھولی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کا آپس میں بھائی چارہ کرایا۔ اور وہ بھائیوں کی طرح آپس میں مل کر زندگی گذارنے لگے۔ اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر عالم گیر ہے اور اسلام ایک عالم گیر اسلامی اخوت قائم کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ عدل: یہ اجتماعی عدل ہی تھا جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی فکرمند تھے اس لئے ابتدائی اور مکی سورتوں میں عدل کا کثرت سے ذکر ہے۔

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتیں ملاحظہ ہوں:۔ (۱) قل امر ربی بالقسط (۴۲) کہو کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ (۲) واوفوا الکیل والمیزان بالقسط (۴۳) اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو۔ (۳) لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (۴۴) بے شک ہم نے اپنے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں۔ (۴) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (۴۵) بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (۵) واذا قلتم فاعدلوا (۴۶) جب تم کچھ کہو تو انصاف کرو۔

عدل برابری اور غیر جانب داری کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ کسی شخص کی عزت واحترام کا اس میں

لحاظ نہ رکھا جائے۔ ایجابی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کی حفاظت کی جائے اور منفی طور پر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جرائم کو روکے مظلومین کے حقوق دلائے اور مفسدین کو سزا دے۔ اسلام خدا کی حکومت زمین پر قائم کرنا چاہتا ہے اور انسان پر انسان کے ظلم کو روکتا ہے۔ اور انسانوں کے ساتھ انسانیت دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ فلاح عام کے لیئے انصاف بے انتہا ضروری ہے۔

۵۔ رواداری: اسلامی حکومت میں اسلام ہر مذہب و فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کے ضمیر اور عبادت کی آزادی کا ضامن ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت لا اکراہ فی الدین (۴۷) یعنی دین میں جبر نہیں ہے اس رواداری کے اصولوں کو بتلاتی ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت تمام مذاہب اسلام کے ساتھ ساتھ مکمل آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ اسلامی نظام فکر دوسرے مذاہب کو نہ صرف مکمل آزادی دیتا ہے بلکہ اجتماعی و سیاسی حدود میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اسلام انسانیت کو رواداری کی بنیاد پر متحد کرنے کے لئے قوی ترین عامل ہے۔ اسلام خلافِ عقل عداوتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور عالمگیر مفاہمت خیرسگالی اور باہمی محبت کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اسلام امن کی ایک سرمدی دعوت ہے۔

اسلامی معاشرہ کے مندرجہ ذیل ادارے اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں:۔ ۱۔ عبادات، ۲۔ خاندان، ۳۔ ریاست، ۴۔ اقتصادی نظام۔

عبادات: عبادات یا مذہبی فرائض اسلامی معاشرہ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اسلام میں مندرجہ ذیل اعمال عبادات کہلاتے ہیں (۱) نماز (۲) رمضان کے مہینہ کے روزے (۳) زکوٰۃ (۴) حج بیت اللہ (۵) ایمان ——— اُمتِ اسلامیہ کے ڈھانچہ میں عبادات کی حیثیت ایک بنیادی پتھر کی سی ہے۔ اسی لئے ان کو بجا طور پر اسلام کے پانچ ستون کہا جاتا ہے۔ تزکیہ نفس اور روحانی فوائد کے علاوہ عبادات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بنانے کے لئے ایک قوی عامل ہیں اور معاشرہ میں ان سے وحدت استحکام اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ نمازوں سے اخلاقی چلن بنانے، مشکلات پر قابو پانے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ روزہ سے انسان اعلیٰ درجہ کی تہذیبِ نفس حاصل کرتا ہے اور خود پر قابو پا سکتا ہے۔ زکوٰۃ ایک لازمی اجتماعی بھلائی کی اسکیم کا کام کرتی ہے اور چند ہاتھوں میں دولت جمع ہونے سے روکتی ہے۔ حج بیت اللہ سے خالص اسلامیت اور عالم گیر اسلامی برادری کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ عبادات تقویٰ کا سنگِ بنیاد ہیں جو اسلام کی کسوٹی ہے۔

خاندان : خاندان اسلامی معاشرہ کی بنیادی وحدت ہے ۔ یہی اسلامی اخلاق و عادات کی تربیت گاہ اور اجتماعی تنظیم کا مرکز ہے ۔ قرآن مجید مسلسل افراد خاندان کو ان کے فرائض یاد دلاتا ہے (۴۸) ۔ عائلی زندگی میں محبت ہم آہنگی اور انصاف جیسی صفات ناگزیر ہیں (۴۹) ۔ خاندان کو بہت سی امانتیں سونپی گئی ہیں (۵۰) ۔ والدین کے ساتھ رحم کا سلوک (۵۱) ۔ عورتوں کے ساتھ مہربانی و شفقت اور یتیموں، حاجتمندوں، ذمیوں اور غلاموں کے ساتھ انسانی برتاؤ کرنا اسلامی معاشرہ کی خصوصیات ہیں (۵۲) ۔ جنسی روابط شریعت کی حدود میں رکھے جائیں ۔ مرد کے ذمہ خاندان کے لئے کمانا اور روزی کا انتظام کرنا ہے ۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد عورت پر فوقیت رکھتا ہے ۔ اس لئے اسلام نے مرد کو عورت پر فوقیت دی ہے ۔ قانون میراث اور شہادت میں ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر سمجھا گیا ہے ۔ لیکن اس کمی کو دوسرے ذرائع سے پورا کیا گیا ۔ مثلاً جہیز کا حق پورا اسی کو پہنچتا ہے ۔ ماں یا بیٹی اور گھر کے معاملات میں بیوی کی حیثیت سے اس کو خصوصی مقام حاصل ہے ۔ ورنہ مرد او رعورت دونوں حقوق و فرائض میں برابر ہیں ۔ دونوں فریقین میں نکاح کے ذریعہ اجتماعی و معاشرتی تعلق پیدا ہوتا ہے ۔

اسلامی ریاست : اسلامی ریاست میں سارا اقتدار خدا اور اُس کے رسول کے ہاتھوں میں ہوتا ہے ۔ اسلام قیصر اور پوپ دونوں کی حکومتوں کو یکجا جمع کرتا ہے ۔ مظہرالدین صدیقی لکھتے ہیں :- "اسلام میں ریاست اور مذہبی امور (CHURCH) ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں امتیاز اس وقت سے اُٹھ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ، اور آئندہ آنے والے نظام کا تعین ہوا " (۵۳)

ریاست کے پیچھے اسلام کا ایک خاص نظامِ فکر کارفرما ہے ۔ اشتراکیت کی طرح یہ بھی نئی ریاست کی پالیسی اور دستور وضع کرتا ہے (۵۴) ۔ قانونِ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اقتدار کی ضرورت ہے ۔ اسلامی ریاست پادریوں کی حکومت (THEOCRACY) نہیں ہے ۔ اس کے لئے مذہبی وجمہوری ریاست (THEODEMOCRACY) یا ایک فلاحی مملکت (WELFARE STATE) کی اصطلاح زیادہ مناسب ہے ۔ یہ دونوں اصطلاحیں جمہوری اور آمری نظاموں کے بین بین ہیں ۔ اس ریاست کے باشندے پورے طور پر آزاد ہوتے ہیں لیکن خدا کے غلام ۔ حتیٰ کہ رئیسِ مملکت بھی قانونِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے ۔

معاشی نظام: اقتصادی امور کو باضابطہ بنانے کے لئے اسلام نے واضح افادی اور مساویانہ اصول و معیار مقرر کئے ہیں۔ اسلام انفرادی ملکیت، کسبِ معاش کے لئے انفرادی کوشش، زکوٰۃ، صدقات اور اُجرت کی فوری ادائیگی کے حق میں ہے۔ دولت کے ارتکاز، سود، مال کو گراں فروشی کی نیت سے روکنے اور زمین کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ہے۔ زکوٰۃ ایک اجتماعی فلاحی نظام ہے۔

قانون: اسلام کے لفظی معنی خدا کے حکم کے سامنے جُھک جانا ہے۔ یہاں خدا کے حکم سے مراد شریعت ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں: "مغرب میں قانون اقتدارِ اعلیٰ کی منشاء کا نام ہے لیکن اسلامی ملکوں میں قانون خدا کی مرضی کا نام ہے۔" (۵۵) شریعت احکام و فرائض کے مجموعہ یا مسلمانوں کے لئے ایک مثالی لائحہ عمل کو کہتے ہیں۔ جس میں ان کی زندگی کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں: "شریعت اُمتِ مسلمہ کا دستور ہے۔" (۵۶)۔ متاخر دَور کے علماء نے اجتہاد کے دروازے کو باوجود مسلسل ترقیٔ تمدن کے بند کر دیا۔ ڈاکٹر اقبال نے اسلامی قانون کے متحرک مزاج کو نہایت فاضلانہ انداز میں اپنی کتاب "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو" میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلامی قانون کے غیر متبدل پہلو کو اس طرح بیان کرتے ہیں: "تمام اسلامی ملکوں میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ شریعت کے تبدیلی پذیر حصہ میں بہت کچھ تغیر کی ضرورت ہے اور اس کا وہ حصہ جس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی تعبیرِ نو چاہتا ہے۔" (۵۷)

اسلامی قانون بنیادی طور پر بلا شبہ مکمل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ جیسا ماضی میں تھا و ہی آج ہے اور آئندہ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ لیکن اس کی تعبیر نامکمل انسان اپنی نسبتوں، اپنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے پیشِ نظر کرتے رہیں گے۔ آسمانی طاقت کو انسانی فہم انسانیت کے حدود میں سمجھتی ہے جو نامکمل، جانب دار اضافی اور کم و بیش وقتی ہوتی ہے۔ اسلام ایک ایسا راستہ ہے جو افراد میں اخلاقی اقدار کے لئے ردِّ عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ ردِّ عمل حالات کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے اور اس دائمی رہنے والے قانون کی مسلسل تبدیل ہونے والے حالات میں مریض انسانیت کی صحت کے لئے کام کرتا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ جو صدیوں سے بند ہے، اس کو کھولنے کے لئے اخلاقی کوشش کی ضرورت ہے جو وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔

اسلام میں فرد کا مقام اور اہمیت

اس ہولناک کائنات میں زندگی کا جو ناٹک ڈرامہ (۵۸) خدا نے پیش کیا ہے، انسان اس کا مرکزی

اداکار ہے۔ زندگی کے اسٹیج پر انسان کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے تمام بامقصد متحرک اور تخلیقی عمل پھوٹتے ہیں۔ انسان ہی اپنے آپ کو زمانہ کی گردش میں ڈالتا ہے۔ اور تاریخ کی طاقتوں اور فطرت کے طریقۂ عمل کو قابو میں کرتا ہے۔ وہ "شر" کی عظیم ترین طاقتوں کے خلاف تن تنہا نبرد آزما ہے جس کا مظہر شیطان ہے۔ وہ ایسے قادر مطلق اور عظیم خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے جس تک کسی کی پہنچ نہیں۔ اور اپنی اخلاقی جدوجہد میں خواہ وہ کامیاب ہو یا ناکام، ایک بھاری امانت کا یہ حامل (۵۹)، قیامت کے روز سزا یا جزا کے لئے خدا کے روبرو تنہا کھڑا ہوگا (۶۰)۔ آخری تجزیئے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فرد ہی شخصی طور پر براہِ راست اپنے اچھے یا بُرے کاموں کا ذمہ دار یا جواب دِہ ہوگا۔ جس کے بعد اس کو جنت یا دوزخ کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اسلام میں ذمہ داری کی آخری آماجگاہ فرد کی شخصیت ہے۔

قرآن کریم میں سارے مفادات کا مرکز و محور انسان ہے۔ خدا نے اس کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے (۶۱)۔ خدا نے اس کو علم عطا کیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں (۶۲)۔ اسی کے ساتھ خدا نے ایک معاہدہ بھی کیا (۶۳)۔ اور اس معاہدہ کو پورا کرنے کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ خدا نے اس کو اپنی امانت سپرد کی۔ اس سے پہلے یہ امانت آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی گئی تھی، لیکن انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بارِ گراں سے ڈر گئے۔ اس امانت کو پورا کرنے میں فرد ایک فریضہ کی حیثیت سے مجبور ہے (۶۴)۔ وہ اچھے عمل (۶۵) کرتا ہے اور اپنے کندھوں پر تقویٰ، پرہیزگاری اور نیک چلن کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ وہ مخلوق کا انعام ہے (۶۶)۔ وہ عظیم خدائی کا مظہر اور آئینہ دار ہے۔ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہے (۶۷)۔ خدا نے اپنی رُوح اس میں ودیعت کی ہے (۶۸)۔ اس کائنات کو خدا نے ایک خاص مقصد کے لئے بنایا ہے (۶۹)۔ یہ ایک محدود اور مادی عالم ہے۔ کائنات میں خلقی طور پر نظم و ضابطہ موجود ہے۔ خالقِ کائنات نے اس میں متحرک قوانین کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے (۷۰)۔ فطرت میں لاقانونیت نہیں ہے۔ کائنات خدا کا مظہر اور نشانی ہے۔ اور طوعاً و کرھاً (۷۱) اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ انسان کے بامقصد عمل کے لئے یہ ایک میدان ہے۔ زمین آسمان اور اس کے درمیان کی چیزیں انسان کے فائدے[۷۲] کے لئے بنائی گئی ہیں اس لئے یہ سب اس کے تابع ہیں۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے انسان کو ان سے مناسب طریقہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

موجودات میں صرف انسان ہی کو عقل عطا ہوئی ہے۔ اس کے پاس اخلاقی اور عقلی قوتیں موجود ہیں۔

اس کو ارادہ کی آزادی حاصل ہے اور وہ آزاد ہو کر کام کرنے کی طرف مائل ہے تاکہ مختلف چیزوں کا انتخاب کر سکے اور ایک باضابطہ زندگی گزار سکے۔ بدلتے ہوئے حالات کے مقابلہ میں اس کے ردّ عمل کو ایک راستہ پر لگایا جا سکتا ہے اور اس کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔ جب وہ اپنا ایمان کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمّد رسول اللہ پر ظاہر کرتا ہے تو اس اظہار سے وہ خدا کا غلام بن جاتا ہے لیکن جملہ مخلوقات پر اس کو تصرّف حاصل ہو جاتا ہے۔ جب وہ خدا کے سامنے جھکتا ہے اور اپنے آپ کو مشیئت ایزدی کے سُپرد کر دیتا ہے تو گویا اپنی آزادی کو محدود کر لیتا ہے۔ خدا کا حکم اس کی آزادی کے لئے حد بندی کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ سماج سے بالاتر کچھ قید و بند اس کی آزادی کی تحدید کرتے ہیں۔ آزادی کے اس عفریت کے پیر میں زنجیر پڑ جاتی ہے۔ اپنی حیوانی خواہشات اور گرے ہوئے ارادوں کی جیل میں بند انسان ایک آزاد انسان بن جاتا ہے۔ اپنے اور اس عالی شان نظام کے درمیان ہم آہنگی حاصل کر لیتا ہے۔ اب معاشرہ کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے وہ کام کرتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اب دُہری ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اس کو اپنی خودی کو پہچاننا ہے، دوسری طرف آفاق کی معرفت ہے۔ ان دونوں کو انسانیت کی بھلائی اور بنی نوع انسان کے مفاد میں اس کو استعمال کرنا ہے۔ ایک بہتر نظام کی تخلیق اور معیار کمال کو حاصل کرنا جو ساری موجودات کا مقصد ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کو شیطان کے خلاف جو "شر" کا مظہر ہے اخلاقی جدوجہد میں مشغول رکھتی ہیں۔ اس کی اس جدوجہد میں اسلام کا وہ خدا جو کائنات سے ماوراء ہے کائنات میں جاری و ساری بھی ہے، اس کی پوری پوری مدد کرتا ہے۔

اسلام ایک عملی نظام فکر ہے اور اعلیٰ مثالی اخلاق کا مظہر ہے جو تخلیقی عمل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صرف چند عبادتوں اور مذہبی رسموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا مکمل اور جامع ضابطہ ہے۔ ایسی بہتر زندگی جس کو خدا کے ساتھ تعامل اور اس کی اطاعت میں گذاری جا سکے۔ جب ایک مسلمان زندگی کی اس مرکزی امانت کو قبول کر لیتا ہے اور ایک مخلوق کی حیثیت سے اس شاہراہ پر اپنا پُر اُمید سفر شروع کر دیتا ہے، اس وقت وہ موجودہ وجود اور مطلوبہ خودی کے مابین یا بالفاظ دیگر واقعی اور مثالی کے درمیان ایک وسیع خلیج محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کی فطرت کمزور (۳) اور نامکمل ہے، غیر منصف (۴)، احسان فراموش (۵)، جاہل (۶)، جلد باز (۷)، ناصبر (۸)، گھبرا جانے والا (۹)، اور باغی (۸۰) ہے۔ ہمیشہ شر کی طرف مائل ہے اور ذلیل خواہشات اور طاغوتی طاقتوں کا

شکار ہے۔ شیطان (۸۱) انسان کا سب سے بڑا دشمن (۸۲) ہے اور سب سے بڑا فریب کار ہے۔ وہ صراطِ مستقیم پر اس کی گھات میں بیٹھا رہتا ہے (۸۳)۔ اور مسلمانوں کو وہ خدا کے راستہ سے گمراہ (۸۴) کرتا رہتا ہے (۸۵)۔ ایک مسلمان اس صورتِ حال کا انفرادی طور پر مقابلہ کرتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔ خیر و شر کے درمیان رستہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ خدا ایمان والوں کی مدد (۸۶) کرتا ہے اور ان کو دوست بناتا ہے جو خیر کے لئے طاغوتی طاقتوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ اس سے فرد کے دل میں مخفی طاقت کی لہریں اُٹھتی ہیں اور اس میں بے شمار قوت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ اس سے انسان اپنا مقصد متعین کر لیتا ہے اور منزلِ مقصود کی جانب صراطِ مستقیم پر چل دیتا ہے۔ خدا کا گروہ کامیاب (۸۷) ہوتا ہے اور شیطان اپنے ماننے والوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا (۸۸) ہوتا ہے۔ فرد ایک حقیقی شخصیت بن جاتا ہے اور اپنے سامنے معیاروں کی ایک دنیا پیدا کر لیتا ہے۔ شیطان پر اس کی فتح اور تقویٰ کا متحرک اصول اس کو زمین پر صحیح معنی میں خدا کا خلیفہ بنا دیتے ہیں اور اب وہ خدا کی اعلیٰ ترین مخلوق کی حیثیت سے کام کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔

اسلام کی یہ منزل بمنزل متحرک ترقی اساسی طور پر روحانی اور اخلاقی ہے۔ خارجی ماحول تبدیل کرنے اور ایک سماجی اخلاقی نظام پیدا کرنے سے پہلے خود فرد کے اندر ایک مخفی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اب یہ تبدیل شدہ خودی ہے جو پہلے شکستہ ہوتی ہے اور بعد میں اسلام کی روح اور اس کی اخلاقی منشاء کے مطابق با ضابطہ اور منظم ہو جاتی ہے۔ اور آخر میں ایک وحدت پیدا کر دیتی ہے جس سے خدائی سلطنت میں ترقی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جب فرد کے دل کی گہرائیوں میں خدا کی معرفت کی کرن روشن ہوتی ہے تو وہ ایک اجتماعی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہے اور معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ معاشرہ میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ شر کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان تمام فلسفوں کی عمارتیں (جو اسلامی اقدار کے مخالف ہیں جن سے جہنم ارضی پیدا ہوتی ہے اور جو ہمیشہ اپنے ماننے والوں کو نیم مردہ حالت میں چھوڑ دیتی ہیں) زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

اس مختصر سے مقالہ میں معاشرہ کی امتیازی خصوصیات اور فرد کے ساتھ اس کے رشتہ کی تفصیلات کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس میں اسلامی معاشرہ کا تاریخی ارتقاء اور اس کے خد و خال نمایاں کئے گئے ہیں معاشرہ میں فرد کے مقام کو بالخصوص اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر واٹ (DR. M. WATT) اسلامی معاشرہ کو افراد کی ایک جماعت سمجھتا ہے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں اسلام کا رجحان انفرادیت کی طرف زیادہ ہے (۹۰)۔ کلارکس (CLARKS) کا خیال ہے کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ معاشرتی اور اجتماعی مذہب ہے (۹۱)۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر نیم صداقت کو ظاہر کرتے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد تصویر کے ایک رُخ پر ہے۔

اوپر اس مقالہ میں ہم یہ بات تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام فکر و عمل کا ایک جامع نظام ہے۔ یہ حقیقت خود بخود روحانی اور دنیوی شخصی اور مجموعی انفرادی اور اجتماعی کے درمیان امتیازات پر خط تنسیخ کھینچ دیتی ہے۔ اسلام حالات کے مطابق کبھی انفرادیت اور کبھی اجتماعیت پر زور دیتا ہے۔ اسلام ہی ان دونوں کے درمیان نہایت عمدگی سے توازن قائم رکھتا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو خدا نے "امۃ وسطا" کہا ہے۔ علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے فرد اور معاشرہ کا اسلامی تصوّر واضح طور پر نمایاں ہے ؎

فرد میگیرد ز ملّت احترام ملت از افراد می یابد نظام

حواشی وحوالجات

۱۔ شورٹر آکسفورڈ ڈکشنری۔ جلد دوم۔ ص ۱۹۳۶۔ (۲) مارس گسبرگ، "سوشیالوجی"۔ ص ۴۰۔

۳۔ "انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکز"۔ جلد نو۔ ص ۶۵۴۔

۴۔ ملاحظہ ہو (TALCOLT PARSON) کا مقالہ زیر عنوان (SOCIETY) "انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائینسز"۔ جلد ۱۳ اور ۱۴۔ ص ۲۳۱ پر۔ (۵)۔ آر۔ ایم۔ میک آور، "ایلیمنٹز آف سوشل سائنس"۔ ص ۲۔

۶۔ سوسن آئزک، "سوشل ڈیویلپمنٹ اِن ینگ چلڈرین"۔ ص ۳۸۸۔ (۷) ملاحظہ ہو قرآن مجید سورۃ علق: ۲۔

۸۔ قرآن مجید۔ سورہ بنی اسرائیل: ۳۱۔ سورہ لقمان: ۴۔ سورہ احزاب: ۱۷۲۔ سورہ زمر: ۴۹۔

۹۔ سورہ البقرہ: ۲۶۔ سورہ الاعراف: ۱۶۔ ۲۰۔ ۲۲۔ سورہ النساء: ۱۱۹۔ سورہ حجر: ۳۹۔ سورہ مریم: ۲۵۔ سورہ روم: ۸۲۔

۱۰۔ سورہ نحل: ۴۔ سورہ بنی اسرائیل: ۵۴۔ (۱۱) سورہ عنکبوت: ۵۷۔ سورہ ق: ۱۶۔ سورہ رعد: ۵۳۔

۱۲۔ سورہ بنی اسرائیل: ۷۰۔ سورہ تغابن: ۳۔ سورہ التین: ۴۔ سورہ البقرہ: ۳۴۔

۱۳۔ سورہ البقرہ: ۳۰۔ ۳۴۔ سورہ الاعراف: ۶۵۔ (۱۴) سورہ الاحزاب: ۷۲۔ ۷۳۔

۱۵۔ سورہ الحجر: ۲۶۔ ۳۰۔ (۱۶) سورہ التین: ۵۔ (۱۷) سورہ انعام: ۵۔ سورہ النحل: ۲۱۔ سورہ الاعراف: ۱۶۔

۱۸۔ قرآن مجید عظیم الشان روحانی طاقت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پوری انسانیت کو بام کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔

جو شخص بھی قرآن مجید کے شروع و آخر پہ سرسری نظر ڈالے گا، اس کو یہ بات خود بخود محسوس ہو گی۔ قرآن مجید کی ابتداء اس طرح ہوئی ہے :۔ الحمد للہ رب العالمین (یعنی ساری تعریفیں اس پروردگار کو سزاوار ہیں جو تمام عالموں کو کمال تک پہنچاتا ہے)۔ اور اس طرح ختم ہوتا ہے :۔ قل اعوذ برب الناس (یعنی تم کہو کہ میں اس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو انسانوں کو کمال تک پہنچاتا ہے)۔ اور شروع سے آخر تک قرآن مجید کا یہی موضوع ہے۔ (ملاحظہ ہو انگریزی ترجمہ قرآن کریم، مولانا محمد علی - ص ۱۶)۔

۱۹۔ اسلام کے لغوی معنی سپرد کرنے یا جھکنے کے ہیں (ملاحظہ ہو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات :۔ ۲ : ۱۲۱ - ۶ : ۱۶۲ - ۳ : ۱۹ - ۲ : ۱۳۱ - ۴ : ۱۲۵ - ۳ : ۸۲)۔ لفظ اسلام اسم معرفہ کی حیثیت سے قرآن مجید کی متعدد آیات میں مستعمل ہے۔ (ملاحظہ ہوں :۔ ۳ : ۱۸ - ۵ : ۳ - ۶ : ۱۲ - ۶۱ : ۷)۔ مسلم وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے سامنے جھکا دے۔ (ملاحظہ ہو آیت ۳ : ۶۶)۔ نیز دیکھئے "دی ڈکشنری آف اسلام" مصنف HUGHES - ص ۲۲۰۔

۲۰۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ "دی اسلامک آئیڈیالوجی"۔ ص ۸۳۔ (۲۱)۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ "اسلام"۔ ص ۱۔

۲۲۔ سید امیر علی: "دی اسپرٹ آف اسلام"۔ ص ۳-۲ (۲۳)۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب: "محمڈنزم"۔ ص ۴۲۔

۲۴۔ اسلام کے پیروؤں کو قرآن شریف میں "امۃ واحدۃ" اور "اُمۃ وسطا" کہا گیا ہے۔

۲۵۔ اسلام کے ماننے والوں کو قرآن کریم میں اُمتِ واحدہ کہا گیا ہے، ملاحظہ ہو قرآن مجید (۲۵ : ۱)۔ خیر اُمت کہا گیا ہے۔ (۴ : ۱۲) اور اُمت فرمایا گیا ہے (۲ : ۱۷)

۲۶۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب: "محمڈنزم"۔ ص ۲۷۔ (۲۷)۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن: "اسلام"۔ ص ۱۔ (۲۸)۔ ایضاً۔ ص ۲۹۔

۲۹۔ قرآن مجید: ۳ : ۱۰۲۔ (۳۰)۔ قرآن مجید: ۵۸ : ۲۲۔ (۳۱)۔ قرآن مجید، ۳ ، ۱۰۳۔

۳۲۔ قرآن مجید، ۲ : ۴۳ - ۴۴، ۶۲ : ۹، ۹ : ۶۰۔ (۳۳)۔ ملاحظہ ہو مسند احمد۔ ج ۶۔ ص ۲۲۶۔

۳۴۔ قرآن مجید۔ ۴۹ : ۱۳۔ (۳۵)۔ قرآن مجید۔ ۶ : ۱۲۳۔ (۳۶)۔ قرآن مجید۔ ۴۶ : ۱۹۔

۳۷۔ المبشر۔ فیثاغورث۔ ۱۷۔ ص ۶۷۔ (۳۸) "عیسائیت اور آزادی"۔ ص ۶۔ مؤلفہ جی۔ تھیبون۔

۳۹۔ قرآن مجید۔ ۲۹ : ۱۳ - ۱۷ : ۱۵ - ۳۵ : ۱۸ - ۲۹ : ۷۔ (۴۰)۔ قرآن مجید۔ ۴۹ : ۱۱۔

۴۱۔ صحیح البخاری۔ ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔ (۴۲)۔ قرآن مجید۔ ۷ : ۲۹۔ (۴۳)۔ قرآن مجید۔ ۶ : ۱۵۳۔

۴۴۔ قرآن مجید۔ ۵۷ : ۲۵۔ (۴۵)۔ قرآن مجید۔ ۱۶ : ۹۰۔ (۴۶)۔ قرآن مجید۔ ۶ : ۱۵۳۔ (۴۷)۔ قرآن مجید۔ ۲ : ۲۵۶

۴۸۔ قرآن مجید۔ ۴ : ۱ - ۴۹ : ۲۔ (۴۹)۔ قرآن مجید۔ ۳۰ : ۳ - ۴۲ : ۳ - ۴ : ۱ - ۴ : ۱۹ وغیرہ۔

۵۰۔ قرآن مجید۔ ۹ : ۹۱ - ۱۶ : ۳ وغیرہ۔ (۵۱)۔ قرآن مجید۔ ۱۷ : ۳ - ۱۲ : ۱۰ - ۴ : ۶ وغیرہ۔

۵۲۔ قرآن مجید۔ ۳:۱۴ - ۲ - ۱۰:۱۲ - ۶:۴ - ۱:۴ - ۳:۳ - ۱۶ - ۱۳ وغیرہ۔

۵۳۔ مظہرالدین صدیقی ؛ "اسلام اینڈ تھیوکریسی"۔ ص۳۱۔ (۵۴)۔ ایضاً۔ ص ۳۰۔

۵۵۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ؛ "پاکستان - ایک اسلامی جمہوریت"۔ ص۱۹۔

۵۶۔ فضل الرحمٰن۔ اسلام۔ ص ۱۔ (۵۷)۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کتاب محولہ بالا۔ ص ۳-۴۔

۵۸۔ ملاحظہ ہو قرآن مجید۔ ۴۴: ۳۸ - ۳۹ - (۵۹)۔ قرآن مجید۔ ۱۷: ۱۵ - ۳۵: ۱۸ - ۳۹: ۷ - ۲۹: ۱۳۔

۶۰۔ قرآن مجید۔ ۶: ۹۵ - ۱۹: ۸۰ - (۶۱)۔ قرآن مجید۔ ۹۵: ۴ - ۶۴: ۳ - ۷: ۱۰ - ۱۲ - (۶۲)۔ قرآن مجید ۲: ۳۰ - ۳۴۔

۶۳۔ قرآن مجید۔ ۷: ۱۷۲ - (۶۴)۔ قرآن مجید۔ ۳۳: ۷۲ - ۷۳۔

۶۵۔ قرآن مجید۔ ۲: ۲۷۷ - ۲: ۶۲ - ۳: ۱۰۹ - ۱۶: ۱۶ - ۲: ۳ - ۲: ۹ - (۶۶)۔ قرآن مجید۔ ۱۷: ۷۰۔

۶۷۔ قرآن مجید۔ ۲: ۳۰ - (۶۸)۔ قرآن مجید۔ ۱۵: ۲۹ - (۶۹)۔ قرآن مجید۔ ۴۴: ۳۸ - ۳۹ - ۴۵: ۴۲۔

۷۰۔ قرآن مجید۔ ۳: ۳ - ۳۳: ۶۲ - ۳۵: ۴۳، ۴۴ - ۱۷: ۷۷ - ۵۸: ۲۳۔

۷۱۔ قرآن مجید۔ ۱۳: ۱۵، ۳۰ - ۳۰: ۲۶ - ۱۶: ۴۸، ۴۹ - ۲۳: ۱۸ - (۷۲)۔ قرآن مجید۔ ۷۹: ۲۷، ۲۵۔

۷۳۔ قرآن مجید۔ ۴: ۲۸ - (۷۴)۔ قرآن مجید۔ ۳۳: ۷۲ - ۱۴: ۳۴ - (۷۵)۔ قرآن مجید۔ ۱۴: ۳۴ - ۱۷: ۶۷ - ۱۰۰: ۶، ۸۔

۷۶۔ قرآن مجید۔ ۳۳: ۷۲ - (۷۷)۔ قرآن مجید۔ ۱۷: ۱۱ - (۷۸)۔ قرآن مجید۔ ۷۰: ۱۹ - (۷۹)۔ قرآن مجید۔ ۷۰: ۲۰۔

۸۰۔ قرآن مجید۔ ۳۷: ۵۴ - ۱۶: ۴۔

۸۱۔ لفظ شیطان شطن سے ماخوذ ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ابلیس اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی کا شر خود اس کی ذات تک محدود رہتا ہے اور شیطان اس وقت استعمال کرتے ہیں جب اپنی ذات کے علاوہ دوسروں پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ (مولانا محمد علی، انگریزی ترجمہ قرآن مجید، ص ۱۹ - حوالہ نمبر ۵۷)۔

۸۲۔ قرآن مجید۔ ۲: ۱۶۱، ۱۶۹ - ۷: ۲۲ - (۸۳)۔ قرآن مجید۔ ۷: ۱۶ - (۸۴)۔ قرآن مجید۔ ۱۵: ۳۹، ۴۰ - ۴: ۱۱۹۔

۸۵۔ قرآن مجید۔ ۵: ۱۳۵ - ۵۹: ۱۶۔

۸۶۔ قرآن مجید۔ ۷: ۴۷ - ۴۷: ۱۱ - ۴۷: ۳۵ - ۲: ۱۵۰ - ۸: ۴۰ - (۸۷)۔ قرآن مجید۔ ۵۸: ۲۲۔

۸۸۔ قرآن مجید۔ ۲۵: ۲۹ - ۵۸: ۱۹ - (۸۹)۔ قرآن مجید۔ ۷: ۲۶ - ۲: ۱۹۷ - ۳۰: ۸۱۔

۹۰۔ منٹگمری واٹ ؛ "محمدؐ مدینہ میں"۔ ص ۳۰۱۔ (۹۱)۔ کلارک ؛ "دس بڑے مذاہب"۔ ص ۴۸۴۔